Date of Publication : 09-07-2014

PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 10-11 July 2014
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C) 160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

15-21 July 2014
Issue: 27, Vol.: 73

۱۵ تا ۲۱ جولائی ۲۰۱۴ء
شمارہ نمبر: ۲۷، جلد نمبر: ۷۳

پہلی قسط

بھوپال میں علمی، ادبی اور تہذیبی خدمات

والیانِ ریاست، عُلمائے کرام اور اہلِ قلم کے وسیلے سے

عارف عزیز (20-گھائی مجز بھونجہ روڈ، تلیا، بھوپال 462001)

وسط ہند کی چھوٹی سی ریاست بھوپال کو علم پروری اور ادب نوازی میں شروع سے ایک منفرد مقام حاصل رہا ہے۔ آزادی سے قبل کی پانچ سو باسٹھ ریاستوں میں یہی وہ واحد سرزمین ہے جہاں کے دو سو چار سالہ نوابی عہد میں سات نوابوں نے چوّن سال اور چار بیگمات نے ڈیڑھ سو سال تک حکمرانی کر کے تاریخ کے صفحات پر اپنا گہرا نقش جمیل چھوڑا ہے۔ بھوپال ریاست کے بانی سردار دوست محمد خاں جب مالوہ سے ہوتے ہوئے یہاں آئے تو مسلمانوں کی آبادی پورے علاقے میں موجود تھی، اردو ان کی زبان تھی کیوں کہ بیرسیہ، رائسین اور سیہور علاقوں میں اردو شاعری کے نمونے اٹھارہویں صدی کی ابتدا سے ملتے ہیں، اس عہد کی ایک بڑی شخصیت بیرسیہ کے قاضی محمد صالح اپنی مثنوی 'اخلاقِ حسنہ' ۱۷۰۷ء میں اور رائسین کے قاضی محمد معظم 'تفسیر ہندوی' ۱۷۱۸ء میں لکھ چکے تھے جو بھوپال کی پہلی نثری تصنیف قرار دی جاتی ہے جب کہ اس کے بیس سال بعد مفتی خیر اللہ صدیقی کی 'فقہ ہندی' منظر عام پر آئی، ان تینوں تصانیف کی لسانی اور ادبی لحاظ سے اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ ان کی زبان نہایت صاف اور شستہ ہے، جس میں فارسی یا دکنی کے اثرات نظر نہیں آتے، عام بول چال کی زبان استعمال کی گئی ہے۔ محققین کا دعویٰ ہے کہ دہلی میں اس کے کافی بعد فارسی کی جگہ اردو رائج ہوئی، اسی طرح یہ خطۂ ارضی نہ صرف علم و ادب کی خدمت میں پیش پیش رہا بلکہ یہاں دوسرے شہروں کے مشاہیر ادب کو بھی بڑے پیمانے پر وقار بخشا گیا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے مرزا غالب کا 'نسخۂ حمیدیہ' مرتب کرکے اپنے خونِ جگر سے اس کا دیباچہ اسی شہر بھوپال میں رقم کیا۔ علامہ سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کو اسی ریاست کے اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا گیا۔ علامہ اقبال اور جگر مرادآبادی کو یہاں سے برسوں ایک خطیر رقم ماہانہ وظیفے کی صورت میں نذر کی جاتی رہی۔ مولوی صدیق حسن خاں جیسے بوریہ نشین کو ان کے علم و فضل کے باعث تاجِ سلطنت پیش کیا گیا اور ممدوح نے اسی شہر میں ڈھائی سو کتابیں تصنیف و تالیف کیں، جنھیں عرب و عجم میں سر آنکھوں پر جگہ دی گئی۔

ریاست بھوپال کی علمی فضا اور ادبی ماحول کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے ہندوستان میں افراتفری اور بدنظمی کے شکار، عالموں، ادیبوں اور دانشوروں کے قافلوں کو یہاں نہ صرف فروکش ہونے کا موقع ملا، یہی وہ دور تھا جب بھوپال کے گھر گھر میں علم و فضل کی شمع روشن تھی، بالخصوص شعر و شاعری کا اتنا چرچا تھا کہ خواتین بھی اس صنف میں اپنے جوہر دکھانے میں پیش پیش تھیں، نواب شاہجہاں بیگم اور ان کے شوہر نواب صدیق حسن خاں دونوں صاحبِ دیوان شاعر تھے اور بیٹی سلطان جہاں بیگم اپنے عہد کی ہی نہیں انیسویں صدی کی لائق و فائق خاتون مصنفہ مانی گئیں، اسی خطۂ ارضی پر اردو کی پہلی ہندو شاعرہ سورج کلا سہائے کو اپنا دیوان 'حریم ناز' مرتب کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔

جہاں تک بیگمات والیانِ ریاست بھوپال کی علمی و ادبی خدمات کا تعلق ہے تو پہلی بیگم ماجی ممولا نے ۱۷۴۲ء میں ریاست کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لیا، وہ حسبِ ضابطہ ریاست کی حاکم نہیں تھیں لیکن اپنے شوہر نواب یار محمد خاں کے انتقال کے بعد ان کے دو کم سن جانشینوں کے لیے کاروبارِ حکومت چلاتی رہیں، جب تک حیات رہیں ان کے اثر و رسوخ میں کمی نہیں آئی، ماجی ممولا نومسلم خاتون تھیں، ان کے بطن سے کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی لہٰذا نواب فیض محمد خاں کی اتالیق بن کر جو یار محمد خاں کی دوسری بیگم کے فرزند تھے، تعلیم و تربیت کا کام انجام دیتی رہیں اور خاندانی سازشوں کا مقابلہ کرنے کے لیے انھیں تیار کیا کیوں کہ اس وقت بھوپال ریاست ایک نازک دور سے گزر رہی تھی اور خاندانی رقابت کے ساتھ ساتھ مرہٹوں کی یورش کا شکار بھی تھی، جس کو ختم کرنے کے لیے وہ سرگرم ہو گئیں، خود پڑھی لکھی نہیں تھیں لہٰذا علم و ادب کی سرپرستی کا ماجی ممولا کے تعلق سے کوئی خاص ذکر نہیں ملتا تاہم ان کی تعمیر کردہ مساجد فنونِ لطیفہ (تعمیرات) سے ان کے شوق کے اظہار کے لیے کافی ہیں۔

نواب نظر محمد خاں کی حادثاتی موت کے بعد ۱۸۳۷ء میں بہ عمر ۱۸ برس عنانِ حکومت ان کی بیوہ محترمہ نواب گوہر قدسیہ بیگم کے ہاتھ میں آئی، جو دینی و دنیاوی علوم و فنون سے آراستہ اور امورِ سلطنت میں ماہر خاتون تھیں، اس لیے ان کے دور میں ریاست بھوپال نے غیر معمولی ترقی کی۔ ریلوے لائن، واٹر ورکس کا نظام، شاندار جامع مسجد کی تعمیر اور ہندو رعایا کے ساتھ رواداری کا سلوک قدسیہ بیگم کے تدبر اور معاملہ فہمی کی جیتی جاگتی مثالیں ہیں۔ انھوں نے نئی نسل کی تعلیم و تربیت کے لیے مدارس کھولے اور باہر سے آنے والے علما و ادبا کو معقول وظائف سے نواز کر بھوپال میں آباد کیا۔ قدسیہ بیگم کے عہد میں شمالی ہند اور دکن کے کئی شعرا نے بھوپال میں قدم رکھا، جن میں حضرت شاہ رؤف احمد رافت رامپوری، عبدالواحد مسکین، بدیع الزماں خورد اور عبدالقادر عثمانی قابلِ ذکر ہیں۔ خاص طور پر شاہ رؤف احمد صاحب جرأت دہلوی کے شاگرد تھے اور اردو کے ممتاز شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ مذکورہ شعرا کی آمد سے بھوپال میں جہاں شعری ماحول استوار ہوا وہیں بیرونی رسم و رواج کو پروان چڑھنے کا موقع بھی ملا۔

۱۸۴۴ء میں اپنے شوہر کے انتقال کے بعد کم سن بیٹی نواب شاہجہاں بیگم کی سرپرست کی حیثیت سے نواب سکندر جہاں بیگم نے زمامِ حکومت سنبھالی، انھیں اپنے شوہر نواب جہانگیر محمد خاں دولہا کی طرح اردو زبان سے گہری محبت تھی، جس کا مظاہرہ بیگم نے شعرا اور ادبا کی دل کھول کر مدد سے کیا۔ شمالی ہند کے سفر پر گئیں تو دہلی اور لکھنؤ کے مشاہیر سے ملاقات کر کے انھیں بھوپال آنے کی دعوت دی جن میں مرزا غالب بھی شامل تھے، لیکن غالب دہلی چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوئے تو وقتاً فوقتاً ان کی مدد کرتی رہیں، اسی

حسن سلوک کا نتیجہ تھا کہ غالب نے اپنے اصل دیوان کا نسخہ اپنے قلم سے صحیح کر کے نذر کیا، جو کتب خانے کی زینت بنا اور بعد میں "نسخۂ حمیدیہ" کے نام سے شائع ہوا۔ سکندر جہاں نے مشاہیر کی تصانیف کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کروایا، ریاست کے قوانین اردو میں مرتب کرائے اور ۱۸۵۹ء میں اردو کو فارسی کی جگہ عدالتی اور سرکاری زبان بنایا۔ انھوں نے سخت ہدایات جاری کیں کہ تمام سرکاری احکامات و ہدایات اردو میں دی جائیں، اردو، فارسی اور ہندی کے مدارس کھولے، خود بھی تصنیف و تالیف کا ذوق رکھتی تھیں لہٰذا کئی کتابیں اردو میں تحریر کیں جن کا ذکر گارساں دتاسی نے اپنے خطبات میں کیا ہے۔ ان کے دور کے اہم شعرا میں امجد علی اشہری، مولانا عباس رفعت شیروانی، مولوی جمال الدین گمنام، منشی احمد یار خاں، قدرت اللہ بہاری، بیگل کشور سیراب، یوسف علی یوسف گوپاموی، سوہن لال فروغ، عبدالعلی تونگر، شاہ فریدالدین سید، امداد علی امداد، اصغر حسین انگر، عبدالحمید عاجز چند قابل ذکر نام ہیں۔ سکندر جہاں بیگم نے بھوپال میں دفتر تاریخ کے ساتھ ۱۸۵۱ء میں "مطبع سکندری" کے نام سے ایک بڑا چھاپہ خانہ قائم کیا، دفتر تاریخ درحقیقت علم و ادب کی ایک اکیڈمی کی ابتدا تھی جس نے مستقبل میں کئی کارہائے نمایاں انجام دیے، اس دور میں بھوپال نے تہذیبی و ثقافتی لحاظ سے بھی اتنی ترقی کر لی تھی کہ اس پر دہلی اور لکھنؤ کا گمان ہونے لگا تھا، اس باذوق نظر خاتون نے ۱۸۵۷ء کے خونی ہنگاموں سے بھی اپنی ریاست کو محفوظ رکھنے کی کامیاب کوشش کی۔ انگریزوں نے ان کی مدبرانہ صلاحیت کا اعتراف کر کے دلی دربار میں "اسٹار آف انڈیا" کے خطاب سے سرفراز کیا اور ان کی سفارش قبول کر کے دہلی کی شاہجہانی جامع مسجد کو جو ۱۸۵۷ء سے انگریزوں کے قبضے میں تھی، نماز کے لیے کھول دیا۔ وہ ہندوستان کی پہلی رئیسہ تھیں جنھوں نے باقاعدہ بیرونی علما و فضلا کو ریاست میں مدعو کیا اور نظام قضا کو اعلا سانچوں میں ڈھالنے والے قوانین مرتب کرانے کے لیے فقیہ اور محقق علما کا بورڈ تشکیل دیا۔ بیگم صاحبہ کو مسلمانوں کی عصری تعلیم سے گہری دلچسپی تھی اور سرسید احمد خاں کے تعلیمی مشن کے ساتھ وہ ذہنی اور قلبی وابستگی رکھتی تھیں۔ سرسید کی بھوپال آمد پر ان سے نہ صرف ملاقات کی بلکہ مالی امداد بھی فراہم کی۔ علی گڑھ میں سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کی خوشی میں سرسید احمد خاں کو ہیرے کی نہایت قیمتی انگشتری تحفے میں بھیجی۔ وہ بذات خود اچھی ادیبہ تھیں، ان کی تحریروں میں سفرنامۂ حج انگریزی زبان میں بھی ترجمہ ہو کر لندن سے بعد میں شائع ہوا۔ بیگم صاحبہ نے ادارہ تصنیف و تالیف قائم کیا اور بھوپال کی تاریخ "تاج الاقبال" کے نام سے مرتب کرائی جو ان کے انتقال کے بعد شائع ہوئی، یہ کتاب ریاست کی تاریخ کا مستند ماخذ شمار ہوتی ہے۔

(باقی آئندہ)

●❖●

جوش ملیح آبادی

دیدہ و شنیدہ

دوسری اور آخری قسط

شاہد احمد دہلوی

جوش صاحب کے دوران قیام دہلی میں ایک دفعہ ڈاکٹر اشرف الحق دلی آئے تو مجھ سے کہا کہ جوش صاحب کے ہاں چلو۔ میں نے کہا "مجھے تو ان کا گھر معلوم نہیں کہ کہاں ہے، کہیں دریا گنج میں رہتے ہیں۔ پھر آپ ہی نے تو کہا تھا کہ جوش سے دور کی دوستی رکھنا۔ ویسے بھی میں شعر و شاعری کا آدمی نہیں اور نہ جوش کا ہم مشرب۔ آج تک میں اُن کے گھر نہیں گیا اور نہ وہ میرے گھر آئے۔ سر راہے گاہے یا کسی اجتماع میں اُن سے سرسری سی ملاقات ہو جایا کرتی ہے۔ آپ اُن کے ہاں ہو آیئے، میں ساتھ جا کر کیا کروں گا؟" ڈاکٹر صاحب نے اُس زمانے میں شراب بالکل چھوڑ رکھی تھی۔ بولے "تمھارا چلنا ضروری ہے۔ اگر وہاں پینے پلانے کا قصہ ہوا تو تم مجھے روک سکو گے۔" لہٰذا مجھے ان کے ساتھ جانا پڑا۔

مغرب کے بعد ہم جوش صاحب کے مکان پر پہنچے، نیچے ایک بڑا سا کمرہ تھا جس میں جوش صاحب کے ساتھ پانچ سات آدمی بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو دیکھا تو سب نے اٹھ کر تعظیم دی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا "شاہد کو تو جانتے ہو نا؟" جوش صاحب نے کہا "جی ہاں، مگر کبھی ملاقات نہیں ہوئی"۔ بیٹھنے کے بعد اوروں سے تعارف ہوا۔ حکیم آزاد انصاری کو میں پہلے سے جانتا تھا، اب وہ جوش صاحب کے ہاں مستقلاً آن پڑے تھے۔ بڑھاپے اور بیماری میں ان کا کوئی پرسان حال نہیں رہا تھا۔ کبھی کسی کے ہاں اور کبھی کسی کے ہاں جا پڑتے۔ میزبان ان کے ہنر کی وجہ سے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیتا۔ اس کے بعد اُن سے شعر لکھوا لکھوا کر اپنی بیاض بھرتا۔ جب وہ اپنے شعر دینے میں پس و پیش کرتے تو میزبان آپ پرائے لگتا۔ حکیم صاحب اس بے غوری اور ناقدری کو تاڑ جاتے اور کسی اور شاگرد یا قدردان کے ہاں اُٹھ جاتے۔ ایک صاحب کا تو پورا دیوان آزاد انصاری ہی کا کہا ہوا ہے۔ دلی میں انھوں نے کئی ٹھکانے بدلے۔ آخر میں ایک مفلس مگر مخلص شاگرد کے ہاں چلے گئے تھے اور جب اُن کی حالت بگڑی اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تو وہ غریب شاگرد حیدرآباد انھیں لے کر پہنچا اور ان کے بیٹے کے گھر انھیں چھوڑ آیا۔ بیٹا اچھا خاصا پیسے والا تھا، مگر یہ پنجر اس نے باپ کو وصول کیا۔ بڈھے میں دھرا ہی کیا تھا۔ دو چار دن بعد اللہ کو پیارا ہو گیا۔ تو یہ آزاد انصاری بھی جوش صاحب کے ہاں موجود تھے۔ نہال سیوہاروی بھی پہنچے ہوئے تھے۔ دور شراب تو جو ہی رہا تھا، ایک گلاس ڈاکٹر صاحب کے لیے اور ایک میرے لیے تیار کر کے پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا "شاہد تو نہیں پیتے اور میں نے بھی آج کل چھوڑ رکھی ہے"۔ جوش صاحب نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بے ساختہ اُن کے منہ سے نکلا:

ساقی کے مدیر اور نہیں پیتے مخمور
برعکس نہند نام زنگی کافور!

"کیا واقعی بالکل نہیں؟" میں نے کہا "جی ہاں، میں نہیں پیتا"۔ جوش صاحب نے از راہِ عنایت مزید اصرار نہیں کیا مگر ڈاکٹر صاحب سے بولے "جی یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ کو تو پینی پڑے گی"۔ یہ کہہ کر ان کے ہاتھ میں گلاس تھما دیا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو ٹہوکا دیا مگر انھوں نے متاسف نظروں سے میری طرف دیکھا اور چپکے سے بولے "جوش نہیں مانتا۔ تھوڑی سی پی لینے میں کوئی مضائقہ نہیں"۔ جوش صاحب کو سرور گٹھ رہا تھا، اُن کی گل افشانی شروع ہو گئی۔ بلا کا حافظہ پایا ہے اس شخص نے۔ نشہ بڑھتا جاتا تھا اور زبان کھلتی جاتی تھی۔ قلندرانہ رباعیوں کے بعد اپنا فحش کلام سنانا شروع کر دیا۔ جب وہ بھی ختم ہو گیا تو فی البدیہہ کہنا شروع کر دیا مگر آخر میں اعتراف بھی کیا کہ اس کا اُستاد تو رفیع احمد خاں ہے۔ دو گھنٹے بعد میں نے اجازت چاہی تو ڈاکٹر صاحب بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ بولے "شاہد، تم مجھے گھر پہنچا کر جانا"۔ باہر نکل کر میں نے تراہا بیرم خاں کا تانگہ کیا۔ پھاٹک سے نیچی حویلی تک انھیں سہارا دے کر لے گیا۔ نیچے کرایہ دار تھے، اوپر کی منزل میں ڈاکٹر صاحب کا قیام تھا۔ زینہ طے کرنا ایک عذاب ہو گیا۔ جب انھیں ان کے کمرے میں پہنچایا تو ان کی چھوٹی بیگم جو اُن کے ساتھ آئی تھیں، بولیں "شاہد میاں، یہ کیا کیا؟" ڈاکٹر صاحب پھٹی پھٹی آنکھوں سے بیوی کی طرف دیکھتے رہے۔ میں نے کہا "بھابی، یہ جوش صاحب کے ہاں سے آ رہے ہیں"۔ تنک کر بولیں "اس مالی طے کے پاس انھیں کون لے گیا تھا؟" میں نے کہا "خود ہی گئے تھے"۔

"شاہد میاں، تم نے بھی انھیں نہیں روکا؟"

"روکا تھا، بھلا یہ رُکنے والے ہیں؟"

ڈاکٹر صاحب بڑبڑائے "بھابی، شاہد کو جانے دو۔ اسے دیر ہو رہی ہے"۔

اس کے بعد خدا جانے میاں بیوی میں کیا نبٹیرا ہوا۔ اگلے دن ڈاکٹر صاحب میرے ہاں آئے تو ان کے بیگ میں ولایتی بوتل موجود تھی اور وہ ہر آدھ گھنٹہ بعد گلاس بھرتے اور پیتے رہے۔ ان کی شراب پھر شروع ہو گئی تھی اور اب خود ان کے روکے بھی نہیں رُک سکتی تھی۔ پھر دو دن تک ڈاکٹر صاحب نہیں آئے تو مجھے مزاج پرسی کے لیے اُن کے گھر جانا پڑا۔ پہلے بھابی اور بچوں کا کمرہ بیچ میں پڑتا تھا۔ بھابی کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ بولیں "نہ کچھ کھا سکتے ہیں اور نہ پی سکتے ہیں۔ ابکائی لگی ہوئی ہے"۔ ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں جا کر دیکھا کہ وہ بے سدھ پلنگ پر پڑے ہوئے ہیں اور ڈاکٹر عمر اُن کے سرہانے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میرے جاتے ہی ڈاکٹر عمر نے میری ٹانگ لی "اماں کیوں لے گئے تھے انھیں اس کے پاس؟" میں نے کہا "اب کیفیت کیا ہے؟" بولے "مر رہے ہیں"۔ میرے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ لو بھئی، اُلٹی آنتیں گلے پڑیں۔ پھر ڈاکٹر صاحب کو بھی کھانسی اُٹھی اور وہ اوہ کرتے ہوئے اُٹھ بیٹھے۔ آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے، چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی، سینے میں سانس نہ سماتا تھا مگر خوش مزاجی کی وہی کیفیت۔ ہانپ کر بولے "بھائی۔

یہ جگر کہتا ہے کہ میں مر رہا ہوں، مگر میں مروں گا نہیں، بھابی ایک گلاس بنا دیجئے"۔ ڈاکٹر عمر نے کہا "مرنے سے بدتر تو ہو گئے مگر چھوڑتے اب بھی نہیں"۔ بولے "تیری طرح کم ظرف تھوڑی ہوں پینے کا نام بھی بدنام کرتا ہے"۔ اتنے میں بھابی بیگم گلاس بنا لائیں۔ ڈاکٹر صاحب کے منہ سے لگا دیا۔ پی کر بولے "بھائی اب میری دوا بھی یہی ہے"۔ غرض ڈاکٹر صاحب ایک ہفتے تک زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ بیہوشی میں ڈاکٹر عمر ان کے انجکشن لگاتے رہے۔ ہوش میں آنے کے بعد انھوں نے شراب نہیں پی۔ مہینے بھر میں ساؤنڈ ہو گئے اور خیر سے حیدرآباد سدھارے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ پطرس بخاری نے مجھے رقعہ بھیجا اور زبانی بھی کہلوا بھیجا کہ سالک صاحب آئے ہوئے ہیں، کل رات کا کھانا میرے ساتھ کھانا۔ میں وقت مقررہ سے کسی قدر پہلے پہنچ گیا تاکہ سالک صاحب سے باتیں کرنے کا موقع مل جائے۔ ہم دو چار آدمی سالک صاحب سے گپ شپ کر رہے تھے کہ جوش صاحب بھی آن پہنچے۔ سلیک علیک کے بعد کوٹھی کے برآمدے میں گئے، وہاں بنگال کشور ہیرا بیٹھے ہوئے تھے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اور پطرس بخاری کے پرسنل اسسٹنٹ تھے۔ جوش صاحب نے اُن سے پوچھا "پینے پلانے کے لیے کیا ہے؟" انھوں نے گھبرا کر کہا "بخاری صاحب تو نہیں پیتے"۔ جوش صاحب نے کہا "وہ نہیں پیتے تو کیا ہم تو پیتے ہیں۔ جاؤ بخاری صاحب سے کہو کہ ہمارے لیے کچھ پینے کو بھیجیں"۔ وہ دوڑے ہوئے آئے اور بخاری سے کچھ کھسر پھسر کرکے پھر جوش صاحب کے پاس پہنچے۔ خبر نہیں ان دونوں کے درمیان کیا گزری۔ مہمان آنے شروع ہو گئے، آنے والوں میں بڑے متضاد قسم کے لوگ تھے۔ خواجہ حسن نظامی بھی تھے اور دیوان سنگھ مفتون بھی۔ تقریباً بیس بغدادی قسم کے حضرات کھانے پر جمع ہو گئے۔ جوش صاحب الگ گھاس پر ٹہلتے رہے تھے۔ مجھے اُن کے قریب جگہ ملی۔ پوچھنے لگے "اسے کس نے بلایا؟" میں نے کہا "کسے؟" خواجہ صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ بولے "جب سے یہ آیا ہے واللہ کفن و کافور کی بو چلی آ رہی ہے"۔ ان کے اس فقرے کا مزہ اور دوں نے بھی لیا اور بات شدہ شدہ بخاری صاحب تک بھی پہنچ گئی۔ وہ کھلکھلا کر ہنسے۔ اس کے بعد جوش صاحب نے بھری میز پر بخاری صاحب کو مخاطب کرکے کہا "دو شعر ہو گئے ہیں، سن لیجئے"۔ مجھے تو شعر وہ یاد نہیں رہے مطلب یہ تھا کہ نام تو بخاری ہے مگر جنوری آتی سی ہے کہ پینے کو شراب مانگو تو ملتا ہے ٹھنڈا برف کا سادہ پانی۔ سب نے واہ واہ سبحان اللہ میں ان اشعار کو اڑا دیا۔ خود بخاری صاحب نے کسی قسم کی ناگواری کا اظہار نہیں کیا بلکہ خوب داد دی۔

فتح پوری کے قریب ایک ہوٹل میں فراق گورکھپوری دلی آکر ٹھہرے تھے۔ شام کو ان کے کمرے میں بہت سارے پینے والے شاعر جمع ہوئے۔ ان میں جوش، نہال، مجاز اور ساغر بھی تھے۔ جوش صاحب تو شاعرِ انقلاب ہونے کے علاوہ شاعرِ اعظم بھی ہیں مگر اپنے پندار میں فراق ان سے اپنے آپ کو کم نہیں کچھ زیادہ ہی سمجھتے تھے۔ جوش نے جب رباعیاں کہنی شروع کیں تو فراق نے بھی اردو ہندی آمیز زبان میں روپ سروپ کی رباعیوں کی بھرمار شروع کر دی، جوش صاحب نے کبھی کسی سے مقابلہ نہیں کیا۔ خبر نہیں یہ ان کی بزدلی ہے یا شرافت، مگر فراق صاحب ہمیشہ میدان میں اتر آتے ہیں اور شمشیر بکف بن جاتے ہیں۔ ویسے تو جوش اور فراق میں بڑا دوستانہ تھا اور دونوں ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے مگر فراق، جوش کو اپنا حریف سمجھتے تھے۔ جب ہوٹل کے کمرے میں کئی دور ہو گئے تو پینے والوں کے دل کھل گئے اور دلوں کے ساتھ زبانیں بھی کھل گئیں۔ جوش اور فراق میں چشمک شروع ہوئی، پہلے مذاق ہی مذاق میں پھر نشہ زدہ سنجیدگی کے ساتھ۔ حاضرین میں سے کچھ جوش کے ساتھ ہو گئے اور کچھ فراق کے ساتھ۔ فراق کچھ حد سے آگے ہی نکل گئے۔ نوبت تیز تازی اور گالی گلوچ تک پہنچی۔ اس میں ذرا کمی آتی تو ساغر کبھی جوش کو شہ دیتا اور کبھی فراق کو۔ فراق ایسے بے قابو ہوئے کہ ماں بہن کی گالیوں پر اتر آئے۔ جوش نے ان گالیوں کو بھی کڑوا گھونٹ بنا کر حلق سے نیچے اتار لیا مگر جب فراق نے بیٹی کی گالی دی تو جوش کے تیور بگڑ گئے۔ بولے "ہم پٹھان ہیں، اب ہم آپ کو قتل کر دیں گے"۔ یہ کہہ کر اٹھنے لگے تو سب نے بڑھ کر ان کو پکڑ لیا اور معاملہ رفع دفع کیا۔ اس سارے قضیے میں ساغر کے چہرے پر جو خباثت کی خوشی تھی وہ دیکھنے کی چیز تھی۔

جوش صاحب اور علی اختر مرحوم کا کسی بات پر اختلاف ہوا۔ دونوں میں بڑی دوستی تھی۔ کوئی بڑی بیہودہ بات ہوئی ہوگی جوش صاحب کی طرف سے جو علی اختر جیسے سادہ قسم کے آدمی کو ناگوار گزری۔ اس زمانے میں نیاز فتح پوری بھی حیدرآباد پہنچے ہوئے تھے۔ ان کے مراسم دونوں شاعروں سے تھے۔ علی اختر تو بچارے خاموش ہو گئے مگر نیاز صاحب نے محسوس کیا کہ انھیں جوش سے بدلہ لینا چاہیے چنانچہ لکھنؤ واپس پہنچ کر نیاز صاحب نے 'نگار' میں کلامِ جوش پر تنقید لکھنے کا سلسلہ جاری کر دیا۔ جوش نے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا کہ یکسر خاموشی اختیار کی۔ نیاز صاحب بک جھک کر خود ہی خاموش ہو رہے۔ جس نوعیت کی تنقید نیاز صاحب لکھتے ہیں اس سے خود اپنی ہمہ دانی فوقیت جتانا مقصود ہوتا ہے مگر پڑھنے والا بھانپ جاتا ہے کہ اس میں جو کچھ بہت ہوتی ہے خلوص مطلق نہیں ہوتا"۔ اس مصرعے میں وہ بات رہی ہے۔ یہ مصرعہ چست نہیں ہے۔ پہلے مصرعے کا دوسرے مصرعے سے ربط نہیں ہے۔ اس میں تنافر ہے۔ اگر یہ مصرعہ یوں ہوتا تو بہتر تھا"۔ اس کے بعد وہ اپنی اصلاح پیش کر دیتے ہیں اور شعر کا اکلا روپ بھی کھو دیتے ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے 'نگار' کا 'جگر نمبر' شائع کیا ہے۔ اُن کا اندازِ تنقید ملاحظہ فرما لیا جائے۔

کرنل اشرف الحق بڑے جہاں دیدہ اور گرم و سرد زمانہ چشیدہ آدمی تھے۔ اوپر سے بالکل ٹھنڈے اور اندر لاوا کھولتا رہتا تھا۔ وہ چار ہی باتوں میں تاڑ جاتے تھے کہ کون کتنے پانی میں ہے، ورنہ آزمانے کے لیے کوئی اٹھا نہ چھوڑ دیتے تھے۔ دکن میں کنانیں رکھنے کا عام رواج تھا۔ یہ جوان عورتیں ہوتی ہیں جو عموماً اوپر کے کام کے لیے رکھی جاتی ہیں۔ ایسی ہی ایک سنگِ اسود کی ترشی ہوئی جوان کنانی تھی ڈاکٹر اشرف کے ہاں ملازم تھی۔ راوی نے بیان کیا کہ ایک شام کو آواز دینے پر یہ دو گلاس اندر سے بنا کر لائی۔ جوش صاحب اس کالی پری کو دیکھ کر دیکھتے ہی رہ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا "دیکھتے کیا ہو، اوپر لے جاؤ"۔ بس اتنا کہنا کافی تھا، آگے ترقی میں۔ گئے ایک طرف لے جا کر التفات کرنے۔ اس نے جھڑک دیا، ناکام واپس آئے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا "سنو جوش، بیوی میری بھی جوان ہے۔ تمہارا کیا اعتبار، کل کو تم اس پر بھی ہاتھ ڈال دو گے لہٰذا آج سے یہ سلسلہ بند"۔ جوش پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور شرمندگی میں انھوں نے واقعی گولکنڈہ آنا جانا چھوڑ دیا۔ ڈاکٹر صاحب ہی جوش کے پاس پہنچ جایا کرتے تھے۔

دلی میں ایک جید عالم ہیں مولانا عبدالسلام۔ قلندر مزاج اور یونان قدیم کے رواقی فلسفیوں جیسے آدمی ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو کے منشی ہیں۔ جس علم سے کبھو خدا کے وجود کو ثابت کر دیتے ہیں۔ ان کا سکوت پہاڑوں کا سکوت اور گفتگو دریاؤں کی روانی ہے۔ اب تو اسی سے اونچے ہوں گے۔ جوش صاحب جب دلی آئے تو ان کی تعریف سن کر ان سے ملنے گئے۔ مولانا نے جب جوش صاحب کے خیالات سنے تو اُن کا ماتھا ٹھنکا۔ بولے "تمہارا دماغ تو شیطان کی کھڈی ہے"۔ اس سے مختصر اور جامع تجزیہ جوش صاحب کا نہیں ہو سکتا۔

اپنے موجودہ حالات سے جوش صاحب سخت نامطمئن و ناخوش ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ مجھ پر پندرہ بیس افراد خاندان کا بار ہے۔ اپنی اولاد کے علاوہ اولاد کی اولاد کے بھی جوش صاحب ہی کفیل ہیں۔ بیاہی تیاہی بیٹی اور داماد بھی انھی کے سر ہیں۔ سنا ہے کہ داماد صاحب بی اے، بی ٹی ہیں۔ اسکول کی ملازمت کو بہت گھٹیا چیز تصور کرتے ہیں۔ حضرت جوش کا داماد اور اسکول ماسٹری! دنیا کیا کہے گی؟ لہٰذا مع بیوی اور جوان جوان بچوں کے جوش کے گھر میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور شاعرِ انقلاب کی عزت و آبرو کی حفاظت کر رہے ہیں۔ جوش صاحب ستر کے پیٹے میں ہیں۔ اتنی عمر اور اتنی دنیا دیکھنے کے بعد بھی ان کے مزاج کا بھولپن نہیں گیا۔

بھولپن پر اُن کے مزاج کا ایک اور پہلو یاد آ گیا۔ اپنی شاعری کی بدولت جوش صاحب ہمیشہ سے حکام رس رہے ہیں۔ اہلِ غرض انھیں گھیرے رہتے ہیں۔ کسی سفارش کرنے میں ذرا بھی جھجک نہیں کرتے۔ سفارش بیشتر نالائقوں ہی کی کی جاتی ہے۔ جوش صاحب نے کسی بڑے آدمی سے کسی کی سفارش کی اور اس کی تعریف کے پُل بھی باندھ دیے۔ بڑے آدمی نے کہا "مگر جوش صاحب، یہ صاحب تو اس جگہ کے لیے موزوں نہیں ہیں"۔

"جی اور کیا بالکل ناموزوں ہیں"۔

"تو اس صورت میں یہ جگہ تو انھیں نہیں دی جا سکتی"۔

چلیے چھٹی ہوئی۔ امید وار سے کہہ دیا کہ "صاحب آپ تو اس جگہ کے لیے قطعی ناموزوں ہیں"۔

اس نے واویلا مچایا کہ "حضرت مجھ سے زیادہ موزوں تو کوئی اور ہے ہی نہیں"۔

"یقیناً آپ سے زیادہ موزوں کوئی اور کیسے ہو سکتا ہے؟"

"صاحب یہ بڑا منصب افسر ہے"۔

"جی ہاں، میرا بھی یہی اندازہ ہے۔ تحت منصب ہے کم بخت"۔

غالباً جوش صاحب سب کو خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس لیے ان کی گفتگو ہمیشہ اثباتی ہوتی ہے۔ اسے آپ چاہیں تو ان کا بھولپن کہہ لیں، چاہے یہ کہہ لیں کہ جوش صاحب بے پیندی کے بدھنے ہیں۔

اسی سے ملتا جلتا واقعہ گلڈ کے قیام کے وقت پیش آیا۔ جمیل جالبی صاحب سے جوش صاحب کا خاصا ربط ضبط ہے۔ طے پایا کہ جمیل صاحب جا کر جوش صاحب کو گلڈ کے پہلے اجلاس میں شرکت کی دعوت دیں۔ جمیل صاحب نے مجھے بھی ساتھ لے لیا۔ ڈرگ روڈ میں اُن کی کوٹھی پر پہنچ کر پھاٹک بجایا تو ایک ادھیڑ عمر کے صاحب تشریف لائے اور بولے "آیا، میں اطلاع کرتا ہوں"۔ جمیل صاحب نے بتایا کہ یہی وہ جوش صاحب کے معروف داماد ہیں جو کچھ نہیں کرتے۔ تھوڑی دیر میں لوٹ کے آئے اور بولے "چلے جائیے"۔ کمرے میں جوش صاحب براجمان تھے اور ان کے چند بہی خواہ انھیں گھیرے ہوئے تھے۔ جمیل صاحب نے گلڈ کی مختصر روداد سنائی اور جوش صاحب سے شرکت کی استدعا کی۔ بولے "ضرور، ضرور، مگر آپ آکر مجھے لے جائیں"۔ جمیل صاحب نے کہا "میں خود آکر آپ کو لے جاؤں گا"۔ مگر وقت مقررہ پر جب جمیل صاحب انھیں لینے گئے تو بے نیل مرام واپس آئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جو لوگ انھیں گھیرے رہتے ہیں انھوں نے جوش صاحب کو یہ کہہ کر بھڑکا دیا کہ گلڈ کی طرف سے آپ کو کوئی عہدہ تو

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

اردو دُنیا

اردو اسکولوں میں اردو کی نصابی کتابوں کی عدم دستیابی کا مسئلہ جوں کا توں

رانی گنج، مغربی بنگال (۲۵ر جون)۔ اردو اسکولوں میں معیاری تعلیم آج بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ ایسے میں کتابوں کی عدم دستیابی سے یہ مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔ تعلیمی سیشن کا آغاز ہوئے 6 ماہ گزر چکے ہیں مگر ابھی تک اسکولوں میں درجہ ششم تا ہشتم کی اردو کی نصابی کتابیں دستیاب نہیں ہوئی ہیں۔ گرمی کی چھٹیوں کے بعد اسکول تو آج سے کھل گئے ہیں مگر کتابوں کی عدم دستیابی کا مسئلہ جوں کا توں برقرار ہے۔ اب اسکولوں میں یونٹ ٹیسٹ کا آغاز بھی عنقریب ہونے والا ہے، ایسے میں اردو کی درسی کتابوں کے نہ ہونے سے طالب علموں کا بھاری نقصان ہوگا۔ محکمہ تعلیم اور بورڈ کو اس جانب توجہ مبذول کرنے اور مناسب اقدام کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ واضح رہے کہ ۶ مہینے کا وقفہ گزر جانے کے بعد بھی محکمہ تعلیم کتابوں کی عدم دستیابی کے مسئلے کو سلجھانے میں قاصر ہے۔ بغیر کتابوں کے یونٹ ٹیسٹ میں کس طرح بچے شریک ہوں گے۔ سبجیکٹ وائز کوئی کتاب موصول نہیں ہو پارہی ہے۔ سرپرستوں کا کہنا ہے کہ یہ اردو زبان کے ساتھ ناانصافی اور ناروا سلوک ہے۔ ان کے بچوں کا مستقبل داؤ پر ہے۔ کتابیں دستیاب نہیں ہیں تو امتحان کس طرح وہ پائیں گے۔ واضح ہو کہ قانون حق تعلیم ۲۰۰۹ آر ٹی ای کے تحت 6 سے 16 برس تک کے بچوں کو پہلی تا VIII تک کے بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم کا حق حاصل ہوگا مگر اس کا نفاذ آج کمزور ہوتا نظر آ رہا ہے۔ اسکول ٹیچروں کا کہنا ہے کہ ایک دو کتابوں کو چھوڑ کر کتابیں موصول نہیں ہوئیں۔ آسنسول محکمہ تعلیم کی جانب سے اپریل کے اواخر تک کتابیں موصول ہونے کی خبر تھی مگر یہ تاریخ بھی گزر گئی اور معاملہ اب بھی جوں کا توں ہے۔ فی الحال کتابیں دستیاب ہوں گی یا نہیں اس ضمن میں کوئی خبر نہیں ہے۔ کارکن حضرات کا کہنا ہے کہ بنگلہ میڈیم کی ساری کتابیں تعلیمی سیشن کے آغاز ہوتے ہی دستیاب ہو گئیں مگر اردو کے ساتھ یہ امتیازی سلوک کیوں؟ کتابوں کی عدم دستیابی کے باعث اپریل کے بجائے جون میں یونٹ ٹیسٹ لینے کا فیصلہ اردو اسکولوں نے لیا تھا اور یونٹ ٹیسٹ عنقریب ہونے والا ہے۔ گرمی کی چھٹیوں کے بعد دوبارہ اسکول کھل چکے ہیں لیکن کتابوں کی عدم دستیابی کی وجہ سے پڑھائی کا نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا ہے۔ (آبشار، کلکتہ)

ٹیا برج میں اردو بی ایڈ کالج کے قیام کی کوشش

ٹیا برج، مغربی بنگال (۹ر جون)۔ عوامی بیداری تنظیم گارڈن ریچ کے کارکنان پر مشتمل ایک وفد ٹیا برج میں اردو بی ایڈ کالج کے قیام کے سلسلے میں ۸ر جون کو جناب شمس افتخار انصاری (ایم ایم آئی سی کلکتہ میونسپل کارپوریشن) کی رہائش گاہ پر ان سے ملا اور بی ایڈ کالج کے نہ ہونے کے نقصانات اور اس کے قیام کی اہمیت و افادیت بیان کرتے ہوئے ان سے اس سلسلے میں تعاون کی گزارش کی۔ وفد کی باتوں کو بغور سننے کے بعد جناب شمس افتخار انصاری نے کہا کہ میں نے یہ عہد کر لیا ہے کہ ٹیا برج گارڈن ریچ سے جہالت کے اندھیرے کو مٹا کر دم لوں گا۔ اس کے لیے مجھ سے جو تعاون ہو سکے گا کروں گا۔ میں نے ہر سال مدھیامک تا پر اور دیگر تعلیمی شعبے میں اچھے نمبروں سے پاس کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ آپ لوگ ایک بہت اہم اور بڑا مسئلہ لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ میں ابھی اپنے علاقے کے ایم ایل اے اور شہری ترقیات کے وزیر فرہاد حکیم سے بات کرتا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے موبائل پر وزیر باتدبیر سے رابطہ کیا اور ۱۰ر جون کو ان کے دردولت پر ملاقات کا وقت تین بجے دن طے ہوا۔ انصاری صاحب نے عوامی بیداری تنظیم کے سکریٹری جناب گھائل جونپوری، رفیق انصاری، ذکی احمد صدیقی، محمد فیروز خان، آرشد افسر حسین، منظر انصاری اور شاہ زیب عالم کو وزیر فرہاد حکیم کے گھر خود اپنی گاڑی سے لے جانے کی پیش کش کی۔ عوامی بیداری تنظیم کا یہ وفد مقررہ وقت کے مطابق ایم ایم آئی سی صاحب کے ہمراہ وزیر صاحب کے مکان پر پہنچا۔ جناب فرہاد حکیم نے وفد کی باتوں کو بغور سنا اور اردو بی ایڈ کالج کے قائم کرنے میں بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔

(اخبار مشرق، کلکتہ)

بھالکی (کرناٹک) میں پہلا سرکاری اردو اسکول قائم

بیدر، کرناٹک (۱۲ر جون)۔ معروف سوشل ورکر جناب محمد ابوطالب پٹیل نے اپنے ایک صحافتی بیان میں بتایا ہے کہ تعلقہ بھالکی کا موضع بھاتمبرہ میں اردو والوں کی خاصی آبادی ہے مگر بدقسمتی کہ یہاں پر کوئی اردو ہائی اسکول نہیں تھا، اس سلسلے میں محمد ابوطالب پٹیل نے اپنی دلچسپی اور جہد مسلسل کے ساتھ عوامی منتخب نمائندوں اور برسر اقتدار حکومتوں سے نمائندگی کرتے رہے تھے، آخرکار اس ضمن میں ان کی کوششوں کی وجہ سے بھالکی کے رکن اسمبلی جناب ایشور کھنڈرے نے آج اردو نوازی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے بھالکی تعلقہ کے موضع بھاتمبرہ میں سرکاری اردو ہائی اسکول کی حکومت سے منظوری حاصل کر لی ہے اور اسی تعلیمی سال سے یہاں تعلیم کا آغاز ہو جائے گا۔ بھاتمبرہ کے اطراف و اکناف کے محبان اردو سے گزارش ہے کہ جماعت نہم میں اپنے بچوں کا داخلہ کروا کر محب اردو ہونے کا ثبوت دیں اور اردو کے فروغ و ترقی میں حصہ دار بنیں۔ جناب ابوطالب پٹیل نے بھالکی کے رکن اسمبلی جناب ایشور کھنڈرے سے ان کی بھرپور نمائندگی پر اظہار تشکر کیا ہے اور ان لوگوں سے بھی اظہار تشکر کیا ہے جنھوں نے سرکاری اردو ہائی اسکول کے قیام کے لیے تعاون کیا ہے۔

(رہنمائے دکن، حیدرآباد)

انجمن ترقی اردو (ہند) آسنسول شاخ کے وفد نے سابق وزیر مولا نے گھٹک سے ملاقات کی

آسنسول اور مضافات میں اردو کے مسائل پر انجمن کی طرف سے 9 نکاتی میمورنڈم پیش

آسنسول، مغربی بنگال (۱۵ر جون)۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کی آسنسول شاخ کے ایک وفد نے آج آسنسول گرلس کالج میں اردو ڈگری کورس کے مطالبہ سمیت 9 نکاتی مطالبے کو لے کر سابق ریاستی وزیر مولائے گھٹک سے ان کی رہائش گاہ پر ملاقات کی۔ انجمن کے وفد میں سکریٹری ڈاکٹر فاروق اعظم، صدر الحاج عبدالجلیل، محمد سمیع الدین ایڈوکیٹ، ابوکونین شاداب ممبر مغربی بنگال اردو اکادمی، محمد سجاد، ماسٹر محمد سلیمان، محمد خلیل خان، حبیب الرحمن اور محمد مختار موجود تھے۔ انجمن کے سکریٹری ڈاکٹر فاروق اعظم نے بتایا کہ انجمن کے وفد کی سابق ریاستی وزیر مولائے گھٹک سے اردو کے نو نکاتی مسائل پر بات چیت ہوئی اور یہ بات چیت کافی اطمینان بخش رہی ہے۔ سابق ریاستی وزیر مولائے گھٹک نے اردو کے تعلیمی مسائل کے حل میں اپنی دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے یہ خوش خبری سنائی کہ آسنسول گرلس کالج میں اسی سیشن سے اردو ڈگری کورس کی پڑھائی کا آغاز ہو جائے گا وہ اس سلسلے میں اسکول کے پرنسپل سے بات چیت کریں گے۔ یاد رہے کہ سابق ریاستی وزیر مولائے گھٹک نے انجمن کے وفد کو یہ خوش خبری بھی سنائی کہ آسنسول میں مائنوریٹی گرلس ہاسٹل اور اردو گرلس ہائی اسکول اور مغربی بنگال اردو اکادمی کی شاخ کے قیام کا منصوبہ ہے۔ مائنوریٹی گرلس ہاسٹل کے سلسلے میں وفد کو بتایا گیا کہ آسنسول شمالی حلقے میں اس کی تعمیر جاری ہے۔ دو منزلہ عمارت کی تعمیر ہو رہی ہے۔ اردو گرلس ہائی اسکول کے سلسلے میں بتایا گیا کہ یہاں دو برس قبل اردو گرلس پرائمری اسکول کھل چکا ہے اس اسکول کو ہر سال اپ گریڈیشن کے ذریعہ ہائی اسکول کر دیا جائے گا۔ مغربی بنگال اردو اکادمی کی شاخ کے بارے میں انھوں نے کہا کہ اس کے لیے زمین دیکھی جا چکی ہے۔ اراضی کا مسئلہ کچھ سامنے آیا ہے۔ اس کے لیے دیر ہوئی ہے، امید ہے کہ اراضی پر آئے ایک مسئلے کو جلد حل کر لیا جائے گا۔ اردو اکادمی کی آسنسول شاخ میں بھی لائبریری اور اردو بھون کی تعمیر ہوگی۔

واضح ہو کہ انجمن کے وفد کی ملاقات آسنسول شمالی حلقے کے ایم ایل اے اور سابق ریاستی وزیر مولائے گھٹک سے کافی خوش گوار رہی ہے۔ وفد نے بھی ان باتوں کا اظہار کیا کہ سابق وزیر مولائے گھٹک اردو کے تعلیمی مسائل کے حل میں خود بھی دلچسپی لے رہے ہیں اور انجمن کو یہ امید ہے کہ بہت جلد اردو کے تعلیمی مسائل حل ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر فاروق اعظم نے کہا کہ ریاستی وزیر کی یقین دہانی سے ہم لوگ کافی پُر امید ہیں، اس کے باوجود اردو کے ان نو مسائل پر وقتاً فوقتاً انجمن کا وفد سابق ریاستی وزیر اور ان کے نمائندے ابوکونین شاداب سے برابر رابطہ بنائے رکھے گا۔

(آبشار، کلکتہ)

اردو زبان میں بھی اسمبلی ایجنڈہ کی تقسیم

ایک خوش آئند اقدام

حیدرآباد (۱۰ر جون)۔ آج تلنگانہ ریاستی اسمبلی میں پہلی مرتبہ اردو زبان کے ساتھ انصاف کیا گیا۔ متحدہ ریاست آندھرا پردیش میں اردو زبان کے ساتھ صرف زبانی ہمدردی جتائی جاتی تھی لیکن جب اس کو روبہ عمل لانے کا معاملہ آتا تو اردو زبان کے ساتھ مسلسل ناانصافی ہوتی رہی۔ متحدہ ریاست آندھرا پردیش میں اسمبلی کا ایجنڈہ صرف دو زبانوں تلگو اور انگریزی میں تقسیم کیا جاتا تھا لیکن 2 جون ریاست تلنگانہ کی اسمبلی میں ایجنڈہ آج اردو زبان میں تقسیم کرتے ہوئے اردو زبان کے ساتھ انصاف کیا گیا۔ متحدہ ریاست میں صرف گورنر کے خطبے کی کاپیاں اور بجٹ کی پیش کشی کے موقع پر ہی اردو کتابچہ تقسیم کیا جاتا تھا۔ اسمبلی کے ایجنڈے کی کاپیاں اردو میں دیکھ کر صرف اردو داں افراد نے خوشی کا اظہار کیا بلکہ تمام سیکولر ذہن کے حامل افراد نے بشمول چیف منسٹر جناب کے چندر شیکھر راؤ کے اس اقدام پر خوشی کا اظہار کیا۔

(رہنمائے دکن، حیدرآباد)

اردو مدارس اور اساتذہ کے مسائل کے حل کے لیے نمائندگی

گلبرگہ، کرناٹک۔ (۱۷رجون)۔ جناب عثمان پاشاہ (جنرل سکریٹری حیدرآباد کرناٹک مسلم ٹیچرس ایسوسی ایشن گلبرگہ) کی اطلاع کے بہ موجب ایوان شاہی گیسٹ ہاؤس میں ایسوسی ایشن کے ارکان کی سرپرستی میں جس کی قیادت جناب واجد اختر صدیقی (صدر ایسوسی ایشن) کر رہے تھے، ایک نمائندہ وفد نے ضلع نگران وزیر ڈاکٹر قمرالاسلام سے ملاقات کی اور انھیں اردو مدارس اور اردو اساتذہ کی حالت زار سے واقف کرواتے ہوئے محکمۂ تعلیمات سے جڑے کئی مسائل کی جانکاری دی اور اپنے مطالبات پر مشتمل ایک یادداشت انھیں پیش کی۔ اس موقعے پر یادداشت کی نقل کا مطالعہ کرتے ہوئے ڈاکٹر قمرالاسلام نے وفد کو یقین دلایا کہ ان کے تمام مطالبات جائز ہیں اور وہ جلد ہی انھیں پورا کرنے کی جانب ٹھوس اقدام کریں گے۔ وفد نے جن مطالبات کو پیش کیا ہے ان میں اردو مدارس اور اردو اساتذہ کی رہنمائی کے لیے تعلقہ سطح پر اردو ای سی او عہدوں کی تقرری کی منظوری دیے جانے، تعلقہ سطح پر ایک اردو بی آر پی کا عہدہ منظور کیے جانے، اردو اکادمی میں کم از کم دو اردو اساتذہ کو رکنیت دیے جانے (کیوں کہ اردو زبان و ادب کی بقا کا مسئلہ اردو مدارس اور اساتذہ سے ہی جڑا ہوا ہے) اردو پرائمری اسکولوں میں سائنس اور انگریزی اساتذہ کی تقرری، ضلع گلبرگہ میں اردو ماڈل پرائمری اسکولوں میں گزشتہ کئی برسوں سے صدر مدرسین کے عہدے خالی پڑے ہوئے ہیں ان پر فوری تقرری کرنے، سرکاری اردو مدارس میں لازمی طور پر فزیکل اساتذہ کے تقرر کیے جانے اور اردو مدرسین کو صدر مدرسین کے عہدوں پر ترقی دیے جانے کے مطالبات شامل ہیں۔ اس موقعے پر تنظیم کے عہدیداروں کے علاوہ جناب ولی احمد اور جناب عبدالجلیل، جناب سید جماعت علی، ذکی انصاری اور دیگر موجود تھے۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

صلاح الدین نیر کو حکومتِ تلنگانہ کا اعزاز

حیدرآباد۔ ممتاز شاعر اور صحافی جناب صلاح الدین نیر کو یوم تاسیس تلنگانہ کے موقعے پر حکومتِ تلنگانہ کی جانب سے کلکٹر حیدرآباد جناب مکیش کمار مینا نے تہنیت پیش کرتے ہوئے باوقار اعزاز سے نوازا۔ اس موقعے پر تلنگانہ مجاہدین آزادی کے علاوہ اردو اور تلگو کے شاعروں اور فنکاروں کو اعزازات پیش کیے گئے۔ جناب صلاح الدین نیر کو شاعر کی حیثیت سے یہ ایوارڈ پیش کیا گیا۔ فنکاروں کے زمرے میں خان اطہر کو اور شعبۂ خواتین کی نمائندگی کے سلسلے میں محترمہ تسنیم جوہر کو بھی تہنیت پیش کی گئی۔ جناب صلاح الدین نیر کو ماضی میں آندھرا پردیش کے سابق وزیر اعلا ڈاکٹر راج شیکھر ریڈی اور جناب چندرا بابو نائیڈو نے بھی ریاست کے بہترین شاعر کا ایوارڈ پیش کیا تھا۔ تلگو یونیورسٹی اور ہندی یونیورسٹی کی جانب سے بھی اعزازات پیش کیے جا چکے ہیں۔ جناب صلاح الدین نیر کی پانچ کتابیں زیر ترتیب ہیں جو عنقریب منظر عام پر آئیں گی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ صلاح الدین نیر اور ان سے متعلق 50 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ تاحال 20 شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی ادارت میں 'خوشبو کا سفر' 17 برس سے باقاعدہ شائع ہو رہا ہے۔

تلنگانہ قانون ساز کونسل سے جاری کردہ اجازت ناموں میں

ریاست کے لوگو سے اردو غائب

رکن اسمبلی محمد علی شبیر کا احتجاج

حیدرآباد (۹رجون)۔ تلنگانہ قانون ساز اسمبلی و کونسل کی جانب سے جاری کردہ پاسوں پر موجود ریاست کے نئے لوگو سے اردو کو غائب کر دیے جانے پر جناب محمد علی شبیر نے برہمی کا اظہار کرتے ہوئے حلف لینے سے انکار کر دیا۔ قائد ایوان جناب محمود علی اور قائد اپوزیشن جناب ڈی سرینواس کے بعد (ڈپٹی فلور لیڈر) کی حیثیت سے جناب محمد علی شبیر کو تیسرے نمبر پر حلف لینا تھا لیکن انھوں نے لوگو سے اردو ہٹا دیے جانے پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے حلف نہ لینے کا اعلان کیا، مگر آخر میں جناب محمد محمود علی (ڈپٹی چیف منسٹر) نے اس معاملے میں مداخلت کرتے ہوئے جناب محمد علی شبیر سے خواہش کی کہ وہ حلف لیں اور کہا کہ حکومت لوگو سے اردو غائب ہونے کے معاملے کی مکمل جانچ کرے گی۔ ڈپٹی چیف منسٹر نے انھیں اس بات کا یقین دلایا کہ وہ اس پورے معاملے کی آگہی کے بعد لوگو میں اردو کو شامل کرنے کے سلسلے میں ضروری اقدام کریں گے۔ جناب محمود علی کے اس یقین دہانی کے بعد جناب محمد علی شبیر نے تلنگانہ قانون ساز کونسل کے رکن کی حیثیت سے اپنے عہدے کا حلف لیا۔ ابتدا میں جناب محمد علی شبیر نے لوگو کے معاملے میں سنجیدہ نوٹ لیتے ہوئے حکومت سے خواہش کی کہ وہ اس مسئلے کو حل کرے۔ انھوں نے کہا کہ یہ اچھی بات ہے کہ حکومت نے تلنگانہ ریاست کے نئے لوگو میں اردو زبان کو بھی شامل رکھا ہے لیکن جب ریاست کے لوگو میں اس زبان کو رکھا گیا تو پھر قانون ساز ادارے کی جانب سے لوگو میں اردو کیوں شامل نہیں کی گئی۔ بعد ازاں جناب محمد علی شبیر نے بتایا کہ اردو کی ترقی اور ترویج کے لیے وہ اپنی جدوجہد ہمیشہ جاری رکھیں گے۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

اردو کو برابری کا حق دیا جائے

سہارنپور، یوپی (۱۸رجون)۔ آل انڈیا ملی حامی تعلیمی مرکز کے سکریٹری جنرل حاجی عبدالنصیر ناصر نے ضلع کے اپنے دورے کے دوران ضلع کے اعلا افسران سے ملاقات کر کے صوبائی سرکار کی جی او نمبر ۲۷ ستمبر ۲۰۱۳ کے حوالے سے مانگ کی ہے کہ اردو کی بابت سرکاری احکام کے بعد بھی زیادہ تر افسران کی نیم پلیٹ صرف ہندی ہی میں لکھی ہوئی ہیں جب کہ ہر نیم پلیٹ کو ہندی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی لکھا جانا ضروری ہے۔ حاجی عبدالنصیر ناصر نے ضلع مجسٹریٹ سندھیا تیواری، ایس ڈی ایم کے وی سی اور دیگر اعلا افسران سے مانگ کی کہ جلد از جلد تمام آفسوں کی نیم پلیٹوں پر ہندی کے ساتھ ساتھ اردو کا بھی استعمال کیا جائے۔ حاجی عبدالنصیر ناصر نے افسران کو باور کرایا ہے کہ جہاں پر اردو پڑھنے والے بچے موجود ہیں وہاں پر ان بچوں کے لیے اردو کا کورس جلد از جلد تقسیم کرایا جائے تاکہ بچے وقت پر اپنی تعلیم شروع کر سکیں۔ حاجی عبدالنصیر ناصر نے افسران سے یہ بھی مانگ کی ہے کہ صوبائی سرکار کی منشا کے مطابق ضلع میں اردو کو برابری کا حق دیا جائے۔

(آگ۔ لکھنؤ)

آندھرا پردیش قانون ساز اسمبلی میں اردو نظر انداز

صرف تلگو اور انگریزی میں گورنر کا خطبہ

حیدرآباد (۱۳رجون)۔ ریاستی قانون ساز اسمبلی میں ہمیشہ ہی سہ لسانی فارمولے پر عمل آوری کرتے ہوئے انگریزی، تلگو اور اردو زبان میں گورنر کا خطبہ اور بجٹ تقریر کی کاپیاں طبع کروانے کی روایت رہی ہے لیکن آج اس وقت تعجب ہوا جب آندھرا پردیش قانون ساز اسمبلی کے پہلے اجلاس کے موقعے پر اسمبلی اور کونسل ارکان کے مشترکہ اجلاس کے لیے ریاستی گورنر کے خطبے کو اردو زبان میں طبع کروانے سے گریز کیا گیا جب کہ انگریزی اور تلگو زبان میں گورنر کے خطبے کو طبع کروایا گیا۔ باوثوق ذرائع کے مطابق بتایا جاتا ہے کہ وائی ایس آر کانگریس پارٹی کے بعض مسلم ارکان اسمبلی اور پریس گیلری میں اخباری نمائندوں کی جانب سے اردو زبان میں گورنر کے خطبے کی کاپی فراہم کرنے کی خواہش کی گئی، جس پر بتایا گیا کہ اس مرتبہ گورنر کے خطبے کو اردو زبان میں طبع نہیں کروایا گیا ہے۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

شمس آباد میں اردو میڈیم جونیر کالج کا قیام

حیدرآباد (۱۳رجون)۔ جناب محمد مشتاق محی الدین (صدر مسلم ویلفیئر ایسوسی ایشن تلنگانہ) کی سرگرمی میں ایسوسی ایشن کی کاوشوں سے کافی عرصے بعد گورنمنٹ جونیر کالج میں اردو میڈیم کا آغاز اس سال سے ہو رہا ہے۔ واضح رہے کہ مسلم ویلفیئر ایسوسی ایشن کی جانب سے تعلیمی اہمیت اور اردو کی ترقی و ترویج کے لیے حکومت ہند اور ریاستی حکومت سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ شمس آباد میں اردو میڈیم کالج کا قیام عمل میں لائیں کیوں کہ شمس آباد منڈل جو کہ تقریباً 43 گاؤں پر مشتمل ہے، جس میں مسلمانوں کی تقریباً 20 ہزار آبادی ہے، اس کے باوجود شمس آباد میں کوئی بھی اردو میڈیم جونیر کالج نہیں ہے۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

تقریباً 20 ہزار کی اردو آبادی میں واحد مولانا آزاد اردو ہائی اسکول

ہگلی، مغربی بنگال (۱۷رجون)۔ ہگلی ندی کے کنارے چندن نگر آباد ہے جہاں اہل اردو کی آبادی تقریباً 20 ہزار ہے اور یہ نہایت ہی پس ماندہ علاقہ ہے۔ اس کے باوجود والدین اپنی بساط بھر اپنے نونہالوں کی تعلیم و تربیت میں لگے ہیں۔ یہاں کوئی جوٹ مل بھی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی مل فیکٹری ہے۔ یہاں کی اکثریت کی ذریعۂ آمدنی مزدوری یا فٹ پاتھ پر دکان داری اور بیڑی کا کاروبار پر منحصر ہے۔ کارپوریشن نے لیز پر زمین دی ہے جہاں واحد گورنمنٹ پرائمری اسکول صبح کے وقت درس و تدریس کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ کل کیمپس کی زمین تقریباً ساڑھے آٹھ کٹھہ ہے۔ ماضی میں یہ علاقہ اردو بازار کے نام سے مشہور تھا مگر اب لسانی تعصب کے سبب اردو بازار میں تبدیلی کر دیا گیا۔ ہائی اسکول میں فی الحال 217 لڑکیاں اور 134 لڑکے کل 351 زیر تعلیم ہیں۔ کل چار تدریسی عملہ پر مشتمل ٹیچر انچارج ہیں جب کہ پارٹ ٹائم چار ہیں تاکہ بچوں کی تعلیم متاثر نہ ہو۔ ایک غیر تدریسی عملہ ہے اور ہیڈ ماسٹر کی پوسٹ خالی ہے۔ اس ضمن میں ٹیچر انچارج اعجاز الحق نے بتایا کہ نہم اور دہم کے لیے تین تین ٹیچر کے لیے کوشش جاری ہے۔ ڈائرکٹر آف اسکول ایجوکیشن سے رابطہ کیا گیا اور درخواستیں دی گئی ہیں مگر ابھی تک پوسٹ سینکشن میمو نمبر نہیں ملا ہے۔ فنڈ کی کمی کے سبب تیسری منزل کی تعمیر نہیں ہو پا رہی ہے۔ ایک بار ایم پی رتنا دے ناگ سے تین لاکھ کی رقم ملی تھی جس سے تعمیری کام ہوا جب کہ ایم ایل اے کی جانب سے کوئی مدد نہیں ملی۔ انھیں لیٹر دیا جا رہا تھا مگر لینے سے انکار کیا تو ۳رجنوری ۲۰۱۴ کو رجسٹری کی گئی۔ دسویں نہم اور دہم میں تعداد بڑھنے پر پوچھا گیا تو کہا کہ چاپدانی سے کچھ بچے آتے ہیں جہاں ایک بھی ہائی اسکول نہیں ہے جب کہ صوبے کے تمام میونسپل علاقوں میں سب سے زیادہ اردو آبادی یعنی 23 فیصد چاپدانی میں ہے۔ لیبارٹری کے بارے میں استفسار کرنے پر بتایا کہ پہلے فنڈ تو ملے پھر یہ کام ضرور ہوگا۔ جغرافیہ کا لیب، کیمسٹری، بائیولوجی، فزکس وغیرہ کے لیے تیسری منزل پر جگہ ہے مگر فنڈ کی کمی آڑے آ رہی ہے اور یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو پا رہا ہے۔ ہائر سکنڈری تک اگر یہ اسکول ہو جائے تو یہاں کے بچے اور بچیوں کو دہم و ازدہم تک تعلیم حاصل کرنے کی سہولت ہو جائے گی۔

(اخبار مشرق۔ کلکتہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : توضیحات و ترسیلات
مصنف : ڈاکٹر محبوب راہی
ضخامت : ۲۲۴ صفحات
قیمت : ۲۵۰ روپے
ملنے کا پتا : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی-۲۵
تبصرہ نگار : ڈاکٹر محمد ذاکر نسائی

ابھی تاحال اشاعت پذیر تمام کتابوں (بالاستثنائے چند) محبوب راہی صاحب کے بیشتر مجموعہ ہائے مضامین (جنھیں موصوف تحقیقی، تنقیدی اور تجزیاتی مضامین سے موسوم کرتے ہیں) کی طرح زیر تبصرہ کتاب بھی اپنے مشمولات کی روشنی میں موضوعاتی اعتبار سے کسی ایک خاص ضابطہ، اصول کی بنا پر ترتیب دی گئی نہیں لگتی ہے کہ اس میں بیشتر مضامین مشہور و معروف اور نسبتاً کم معروف تخلیق کاروں کے فکر و فن پر ہیں تو چند ایک ان سے ہٹ کر مختلف ادبی موضوعات یا مباحث کا منظرنامہ پیش کرتے ہیں، جہاں بیشتر مضامین کے عنوانات ہی میں ان کے تخلیق کاروں کے ناموں کی شمولیت موجود ہے تو چند ایک ان کی تصانیف کے عنوانات پر مشتمل ہیں مثلاً قاضی حسن رضا، رفیق شاہین، شاہد جمیل، اثر انصاری، صہیب راحت، تسنیم انصاری، انور حیات، صابر فخرالدین، بشیر شوالوری، پرویز یاقی، اقبال اشہر، عیسیٰ انجم وارثی، ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی، شہود عالم آفاقی، مشتاق احمد وانی، مظفر صدیقی، سحر شاہجہاں پوری، وسیم روحانی، شبیر فراز اور افضال عاقل کے اسمائے گرامی ان کے فکر و فن پر لکھے گئے مضامین کے عنوانات ہی میں شامل ہیں۔ درج ذیل عنوانات محض قلم کاروں کی تصانیف سے مستعار ہیں مثلاً لاگ لپیٹ کے بغیر (مظفر حنفی)، ایک منزل کئی فاصلے (یعقوب شروش)، تخلیقی تجربے (ایم نسیم اعظمی)، منظر، موسم، خواب (صبا فریدی)، سفر رفعت پرواز کا (ساحل قلم نوری)، شاعری کا ایک مثبت اور اقداری پہلو (عزیز خاں عزیز)، بہتا لہو جلتے جسم (شکیل انجم دہلوی)، یوسف کا بکہ کردار (یوسف الدین یوسف)، آسماں پر آسماں (شکیل گوالیاری)، سمر کرنہ نور و ظلمت (یعقوب شروش)، ساحل کی رہگذر تحقیق کی ایک اور منزل (شرف الدین ساحل)، تاکہ سند رہے (ملک زادہ منظور احمد)۔

بے ضابطگی کا ایک اور جواز جسے افراط و تفریط کا نام بھی دیا جا سکتا ہے مشمولہ مضامین میں چند ایک کا طویل اور چند ایک کا مختصر ہونا ہے۔ قاضی مشیر (ڈائریکٹر روزنامہ رہبر اورنگ آباد) نے اپنے پیش لفظ میں ڈاکٹر محبوب راہی کو ایک بے پناہ شخصیت قرار دیتے ہوئے ان کے ہر صنف سخن میں مرد میدان ہونے کا لوہا مانا اور منوایا ہے بقول ان کے "محبوب راہی نے ہر صنف سخن نثر اور نظم میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ساتھ ساتھ اپنا خود کا لہجہ، اسلوب اور مقام کا تعین بھی کروایا ہے"۔ قاضی صاحب کی اس تعریف کی تصدیق و توصیف مشمولہ مضامین کی ہر سطر سے ہوتی ہے۔ کتاب کو فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کی مالی اعانت حاصل رہی۔ کتاب صاف ستھری اور عمدہ طباعت سے مزین ہے۔

○○

نام کتاب : **تفہیم شعر**
مصنف : ڈاکٹر اسلم جمشید پوری
ضخامت : 256
قیمت : 130 روپے
ناشر : سوزان پبلشنگ ہاؤس
۹۔ گولا مارکیٹ دریا گنج
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
تبصرہ نگار : امیر حمزہ
ameerhamzah0336@gmail.com

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کا عصر حاضر کے نوجوان ناقدین میں شمار ہوتا ہے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ان کی تخلیقی کاوشوں سے ہوتا ہے اور انھوں نے اپنی تخلیق کا محور افسانوی ادب کو بنایا ہے اور اب تک دو سات کتابوں کے تخلیق کار بن چکے ہیں۔ انھوں نے اپنی تنقید کا میدان بھی افسانوی ادب کو ہی بنایا اور افسانوی ادب کے اوپر پانچ تحقیقی و تنقیدی کتب ان کے قلم سے وجود پائے۔

زیر تبصرہ کتاب واحد کتاب ہے جس میں وہ افسانوی دنیا سے شاعری کی دنیا میں داخل ہوئے ہیں۔ اس کتاب کو اگرچہ آپ ضخیم کتابوں میں شمار نہیں کریں گے لیکن اس کتاب میں بھی انھوں نے پچیس شاعروں کی شاعری اور ان کے فلسفے کو ایک خاص نقطۂ نگاہ سے پرکھنے کی کوشش کی ہے، جن کی جانب دوسرے ناقدین کی نظر بہت ہی کم گئی ہے۔

انھوں نے اپنی اس کتاب کو نظم اور غزل اور کے باب کے تحت رکھا ہے پھر نظم میں جدید نظم نگاروں کو شمار کیا ہے اور ان کی نظم نگاری کے نایاب پہلوؤں کو سامنے لایا ہے، جن میں ایک اہم عنوان "جدید مرثیہ کا آغاز اور جمیل مظہری کے مراثی" ہے اگرچہ ہم قدیم مرثیہ کو زیادہ دھیان میں رکھتے ہیں لیکن اس عنوان کے تحت جدید مرثیہ نے کتنی ترقی کی ہے، جدید مرثیہ کے تقاضے کیا ہیں اور جدید مرثیہ کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے اس پر انھوں نے تحقیقی قلم اٹھایا ہے۔ اس باب میں انھوں نے مجاز، شکیل، شہریار اور کیفی اعظمی کی نظمیہ شاعری کا تجزیہ کیا ہے۔

نظمیہ شاعری ہی میں نئی دھنک کے باب کے تحت دو شاعروں سید احمد شمیم اور سید اطہر الدین اطہر کو اپنے تنقیدی قلم سے جدید نظم نگاروں میں ایک اہم مقام عطا کروانے میں معاون ثابت ہو رہے ہیں۔ سید شمیم احمد کی نظموں کے متعلق ایک بہت طویل مضمون ہے جس میں انھوں نے ان کی شاعری کے تمام زاویوں سے بحث کیا ہے۔ ان کی شاعری کے متعلق رقمطراز ہیں "ان کی نظموں کے لفظ ایک دوسرے میں اس طرح ضم ہیں کہ ان کے معنی بھی ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ایسی کائنات خلق کرتے ہیں جو ارمان کی نئی دنیا آباد کرتے ہیں۔ یہ دنیا پروین شاکر کی رومانی کائنات، ساقی فاروقی کی جنسی رومانیت اور احمد فراز کی حسین شعری کائنات سے نہ تو کم ہے اور نہ ان کے مماثل بلکہ سب سے الگ سب سے مختلف"۔ اسی طرح سے 'نظم کا جادوگر' کے عنوان سے سید اطہر الدین اطہر کی شاعری کے تمام گوشوں پر انھوں نے روشنی ڈالی ہے۔

غزل کے باب کے تحت کے عنوانوں میں "میر کی شاعری اور ماس کیونی کیشن" ایک اہم عنوان ہے۔ انھوں نے میر کی شاعری کو بالکل ایک نئے انداز سے دیکھا اور ان کی شاعری کی اہمیت کو موجودہ زمانے میں اجاگر کیا اور ان اشعار کی معنویت کو بخوبی پیش کیا جو ماس کیونی کیشن میں اہمیت کے حامل ہیں۔ داغ کی شاعری کے متعلق اگرچہ بہت کچھ لکھا اور پڑھا گیا لیکن اس کتاب میں آپ کو داغ کے مطلعوں میں زندگی کے رنگوں کے قوس و قزح کے بارے میں بہت کچھ پڑھنے کو ملے گا جیسا کہ لکھتے ہیں: "داغ کی غزل میں یوں تو ہر شعر اپنی الگ اہمیت کا حامل ہے، خواہ وہ مطلع ہو، حسن مطلع ہو یا پھر کوئی شعر، لیکن داغ کے مطلع ہمیں اس طرح اپنے حصار میں لیتے ہیں گویا آفری پھندہ کس دیا ہو"۔ اس باب میں انھوں نے احمد فراز، مظفر حنفی، مجروح سلطانپوری اور حامد عظیم آبادی ہر ایک غزل گو پر اہم تحریریں پیش کی ہیں۔ غزل میں نئی دھنک کے باب کے تحت آٹھ شاعروں انجم عمادی، یونس غازی، قمر قریشی، کامل آفریدی، شہباز ندیم، خواجہ جاوید، ندیم عرشی اور سراج گلاؤٹھی ان میں سے ہر ایک کے متعلق سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

تصوف کے باب کے تحت تین شاعروں کو پیش کیا ہے جس میں دو بہت ہی مشہور ہیں اور ایک کم معروف شاعر اسلم بدر کو بھی پیش کیا ہے۔ اگرچہ علامہ اقبال کے تصوف کے حوالے سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن ان کی دس صفحوں کی تحریر جو اس کتاب میں شامل ہے، ایک مختلف زاویہ نظر سے ان کے فلسفۂ تصوف کو پیش کیا ہے، یہ ایک غیر معمولی تحریر ہے۔

زیر تبصرہ کتاب جو 'تفہیم شعر' کے نام سے موسوم ہے اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ ہر ایک کی شاعری کے سلسلے میں کچھ نیا پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب اپنی طباعت کے اعتبار سے عمدہ ہے اور قیمت کے تناسب سے معمولی۔

■■

بقیہ: جوش ملیح آبادی: دیدہ وشنیدہ

صفحہ ۳ سے آگے

پیش ہی نہیں کیا گیا۔ اس صورت میں آپ کا جانا مناسب نہیں۔ دوسرے دن الیکشن ہونے والا تھا، اس میں پانچ چھ سو ادیب اور شاعر عہدیداروں اور مجلس عاملہ وغیرہ کا انتخاب کرنے والے تھے۔ مگر جیسے جوش صاحب کو عہدہ کون دے جاتا؟ چناں چہ آج تک جوش صاحب گلڈ کے ممبر نہیں بنے اور ان کے دل میں یہی سمائی ہوئی ہے کہ انھیں گلڈ میں کوئی بڑا عہدہ ملنا چاہیے۔ گویا گلڈ میں عہدوں کی خیرات بٹ رہی ہے جس کی تقسیم ان کے گھر سے شروع ہونی چاہیے۔

بہت سی خرابیاں ہیں جوش صاحب میں۔ خرابیاں سب میں ہوتی ہیں، کسی میں کم کسی میں زیادہ۔ مگر اپنی تمام خرابیوں کے باوجود جوش ایک مقناطیسی شخصیت کے مالک ہیں۔ ان سے طبیعت متنفر نہیں ہوتی۔ ان سے محبت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ شعر کا تو ان کے جواب ہی نہیں ہے۔ مشاعروں میں جب وہ پڑھتے ہیں تو سب کے چراغ گل ہو جاتے ہیں۔ باتیں بھی بھولی بھولی اور مزے دار کرتے ہیں۔ بس، وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ ایک بچا ہوا مفلس شاعر پاکستان میں ان سے لپٹ گیا، کبھی حیدرآباد میں ان کی جان کو لگا رہتا تھا۔ کچھ عرصہ ہوا اچانک اس کا انتقال ہو گیا۔ اللہ اس کی روح کو نہ شرمائے، بڑا ہی بے غیرت تھا۔ جوش صاحب نے اس کا نام ہی کٹ رکھ دیا تھا۔ سنٹرل ہوٹل میں جوش صاحب کو کسی نے عصرانہ دیا۔ عصرانہ ختم ہوا، جوش صاحب نے اپنا کلام سنانا شروع کیا کہ مرحوم کھڑ کھڑ کرتا آپہنچا۔ جوش صاحب نے میزبان سے کہا "دیکھو، وہ کٹ آیا ہے، اسے کچھ کھانے کو دو"۔ کٹے نے خوب سیر ہو کر کھایا اور داد دینے آبیٹھا۔ مرحوم ہر فن مولا تھا، نثر بھی لکھتا تھا، شعر بھی کہتا تھا۔ یزید کی تعریف میں ایک پوری کتاب بھی اس نے لکھی تھی جسے چھاپنے کے لیے اسے کوئی پبلشر نہیں ملتا تھا۔ گانے بجانے میں بھی کچھ دخل تھا۔ کھانے بھی پکا لیتا تھا۔ ایک دفعہ جوش صاحب سے بولا:

"مچھلی تو کبھی میں آپ کو پکا کر کھلاؤں گا۔ آپ انگلیاں ہی چاٹتے رہ جائیں گے"۔

"ارے بھئی تو کھلاؤ نا کسی دن"۔

"کل ہی لیجیے"۔

اگلے دن وہ مچھلی پکا کر لے گیا۔ اچھی پکائی تھی، مگر چلتے وقت مچھلی کے ساتھ سولہ روپے کچھ آنے بھی لاگت کے جوش صاحب سے لے گیا۔

جوش صاحب جس گھن گرج کے شعر کہتے ہیں پڑھتے بھی اسی گھن گرج

سے ہیں۔ روزانہ صبح کو باقاعدگی سے شعر کہتے ہیں۔ شائقین اُن کا کلام سننے کے لیے بیتاب رہتے ہیں۔ آج تک کوئی مجموعۂ اشعار ان کا نہیں چھپا۔ سابق چیف کمشنر نقوی نے سابق صدر سکندر مرزا کو باور کرا دیا تھا کہ جوش اردو کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ یہ لطیفہ حکومت کے ایک بڑے عہدیدار نے سنایا کہ کوئی وزیر قسم کا انگریز پاکستان آیا ہوا تھا۔ ایوانِ صدر میں اس کے اعزاز میں ڈنر تھا۔ معزز مہمانوں میں جوش صاحب بھی شامل تھے۔ آج کل تو کھڑا کھانا (بوفے) ہوتا ہے۔ کھاتے بھی جاؤ اور ذرا ٹہل کر مہمانوں سے باتیں بھی کرتے جاؤ۔ معزز مہمان کے ساتھ ٹہلتے ہوئے سکندر مرزا جوش صاحب کے قریب آ گئے۔ جوش صاحب کا نام تو انھیں یاد نہ آیا، تعارف کراتے ہوئے بولے

"Meet the Greatest Poet of Urdu"

وہ بھی ایک ہی بوجھ بجھکڑ تھا۔ ہاتھ بڑھا کر بولا:

"Oh I see! So you are Mr. Ghalib."

انجمن دانشورانِ ادب کے صدر جناب عبدالخالق عبدالرزاق ایک قابل اور علم دوست آدمی ہیں۔ اصل وطن تو دلی تھا مگر سالہا سال سے کراچی میں رہتے ہیں۔ سگریٹ کنگ کہلاتے ہیں۔ مہینے دو مہینے میں اُن کے ہاں ایک پُرتکلف دعوت ہوتی ہے جس میں پندرہ بیس ممبر اور دو چار اعزازی مہمان شریک ہوتے ہیں۔ اتفاق سے اس انجمن کے تقریباً تمام ممبر خوش خور بھی ہیں (سوائے جناب صدر کے، جو کھاتے کم ہیں مگر کھلا کر زیادہ خوش ہوتے ہیں) لہٰذا شیخ صاحب کھانے کا نت نیا اہتمام کرتے ہیں۔ کبھی بریانی اور قورمہ کی دعوت ہوتی ہے، کبھی سیخ کے کباب اور پوریوں کی، کبھی مرغ مسلم کی اور کبھی آموں کی۔ جاڑوں میں نہاری اور پایوں کی دعوت ہوتی ہے۔ کبھی کبھی اس میں جوش صاحب بھی شریک ہوتے ہیں۔ شیخ صاحب ان کے قدردان اور ناز بردار ہیں، اس لیے اُن کے لیے عمدہ سے عمدہ شراب بھی منگواتے ہیں۔ مغرب کے بعد ہی مہمان جمع ہو جاتے ہیں۔ فضلی، ماہر القادری، محمد تقی، رئیس امروہوی، جون ایلیا، رازق الخیری، اے ڈی اظہر، صہبا لکھنوی، ممتاز حسین، شان الحق حقی، الطاف گوہر، مجاہد صاحب اور کئی اور حضرات جن کے نام اس وقت یاد نہیں آ رہے۔ شیخ صاحب کی کوٹھی کے عقب والے سرسبز صحن میں بیضوی حلقے میں کرسیاں لگی ہوتی ہیں۔ مہمان آتے جاتے ہیں اور بیٹھتے جاتے ہیں۔ ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی ہیں۔ جوش صاحب کی میز الگ ایک طرف لگی ہوئی ہے۔ شراب کی بوتل ہے، سوڈا ہے، تھرمس میں برف کی ڈلیاں ہیں، دو گلاس ہیں، ایک ٹائم پیس بھی میز پر دھری ہوئی ہے کیوں کہ جوش صاحب گھڑی رکھ کر پیا کرتے ہیں۔ وقت ختم ہوا شراب کا دور ختم ہوا۔ مجاز مرحوم کو بھی جوش صاحب نے نصیحت کی تھی کہ میاں گھڑی رکھ کر پیا کرو۔ اس بلا نوش نے جواب میں کہا تھا کہ "میرا بس چلے تو گھڑا رکھ کر پیوں"۔

جوش صاحب کا ساتھ دینے کے لیے ایک اور صاحب جا بیٹھتے ہیں۔ جوش پیتے رہتے ہیں، یہ چسکی لگاتے رہتے ہیں۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں جوش صاحب پانچ چھ گلاس پی جاتے ہیں، یہ دو ہی میں چہک جاتے ہیں اور جب کھڑے ہوتے ہیں تو ان کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگتی ہیں۔ جوش صاحب میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا۔ کھانے کا وقت ہو گیا۔ لمبی میز پر کھانا چنا گیا۔ کھڑا کھانا بھی ہوتا ہے اور بیٹھا کھانا بھی۔ جوش صاحب کا کھانا انھی کی میز پر پہنچ گیا۔ ماشاءاللہ خوش خور ہیں، جبھی تو ستر سال کی عمر میں بھی تانے بنے ہوئے ہیں۔ سچ ہے "ایک ذائقہ چلے، ستر بلا ٹلے"۔ شیخ صاحب ایک ایک کے پاس جا کر کہتے ہیں "آپ نے یہ تو لیا ہی نہیں"۔ "آپ تو کچھ کھا ہی نہیں رہے"۔ "بھائی آپ کیا کر رہے ہیں؟ یہ لیجیے نا"۔ اصرار کر کر کے سب کو کھلا رہے ہیں۔ "شیخ صاحب آپ بھی تو کچھ لیجیے نا"۔ "جی ہاں، میں بھی کھا رہا ہوں" یہ کہہ کر انھوں نے کچھ چکھ لیا اور آگے بڑھ گئے۔ ماہر القادری کھانے کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتے ہیں یعنی اتنا کہ اس کے بعد مزید انصاف کرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ اتنے میں برف میں لگے ہوئے آم آ جاتے ہیں تو مولانا تاسف سے فرماتے ہیں "ارے! یہ تو پہلے بتا دینا چاہیے تھا کہ آم بھی ہیں"۔ میں نے کہا "ابھی تو نقصان ہے مولانا شارٹ ہینڈ میں کھانے کا"۔ اور صہبا کہتے ہیں "قوم کا نقصان کر دیا شیخ صاحب نے"۔ پھر قوم آموں پر دست درازی شروع کرتی ہے مگر مولانا ماہر القادری بھی تین دانوں سے زیادہ نہیں کھا سکتے۔ آموں سے نمٹنے نہیں پاتے کہ آئس کریم آ جاتی ہے۔ مولانا افسردگی سے کہتے ہیں "لیجیے ابھی یہ بھی باقی ہے"۔ اس کے لیے بھی کہیں نہ کہیں گنجائش نکل آتی ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر سب کرسیوں کے حلقے میں آ بیٹھتے ہیں۔ جوش صاحب بھی حلقے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ان کے داہنے ہاتھ سے شعر خوانی کا چکر چلتا ہے۔ شاعر اپنا اپنا کلام سناتے ہیں۔ آخر میں جوش صاحب کا نمبر آتا ہے، وہ خوب اسٹیم بھر چکے ہیں۔ ایک بیاض سامنے رکھ کر شروع ہو جاتے ہیں۔ کس بلا کا کلام ہے سننے والے پھڑک پھڑک کر داد دیتے۔ بیسیوں بند کی طویل نظم ہے مگر اکھرتی نہیں۔ جی یہی چاہتا ہے کہ نظم کبھی ختم نہ ہو۔ اور ماشاءاللہ کتنی جان ہے پڑھنے والے میں، پوری آواز سے پڑھتے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا۔ آواز کھرکھرائی تک نہیں۔ کیا اس شاعر کا بھی ایک وصف ایسا نہیں کہ اس کے تمام عیوب کو نظر انداز کر کے اسے گلے سے لگا لیا جائے؟

ع: نازت اکشم کی تازگی

٭٭٭

موسم کو سیاست نے بنایا ہے لہو رنگ
اس کو کوئی قدرت کا کرشمہ نہ سمجھ لے

یہ محبانِ وطن کی گفتگو
ایک خوش فہمی ہے خوش حالی جناب

اپنے تاریک گھروندوں کا خیال آتا ہے
دیکھتے ہیں جو کبھی نور کے منظر ہم لوگ

کھلونا ہاتھ میں آنے سے پہلے ہی جہاں ٹوٹے
وہیں ہے خونِ حسرت کا وہیں ہے موت ارماں کی

محولہ بالا اشعار کے طرزِ فکر و اظہار کے علاوہ درد ہوشیارپوری کی غزل میں ایک گونہ داخلی و انفرادی طرزِ احساس بھی دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس نوعیت کے اشعار میں شاعر کے نہاں خانۂ وجود اور جسم و جاں کے متنوع احساسات کا انکشاف ہوتا ہے۔ داخلیت آمیز ان شعری پیکروں میں شاعر کی کائناتِ دل کے اسرار کھلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں، ان میں قاری کی ذہنی مشارکت کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ میرے خیال سے درج ذیل شعری نمونے جدید غزل سے کسی قدر ہم آہنگ معلوم ہوتے ہیں:

اشکِ غم تا حیات رونا ہے
ان سے مل کر اداس ہونا ہے

وہ میری روح کی گہرائیوں میں پنہاں ہے
غلط ہے یہ کہ میں اس کو بھلائے بیٹھا ہوں

پھر کوئی آیا ہے پیغامِ محبت لے کر
پھر وہی درد کا احساس وہی دل ہوگا

ہے نقش یہ دیوار ترے ہجر کا منظر
تو اس میں بھی وصل کے کچھ رنگ تو بھر دے

چہرہ کے جھلسنے میں ذرا وقت لگے گا
گو جسم میں سانسوں کی تپش تیز بہت ہے

جاتی تو کہاں جاتی مجھے چھوڑ کے اے درد
جز میرے شبِ غم کا پرستار نہ تھا اور

اپنے کردار کو ہر چند سنبھالے رکھا
میں نے گرتی ہوئی دیوار کو گرنے نہ دیا

میں اسے عشق کہوں یا کہ تغزل سمجھوں
میری غزلوں میں ترے حسن کا پیکر بولے

اکثر وفورِ شوق میں کرتا ہوں گفتگو
پھولوں سے تتلیوں سے بھی مہتاب سے

جو ملا ہے کسی ہمدرد کی ہمدردی سے
درد اس درد کا مشکل سے مداوا ہوگا

درد ہوشیارپوری کا سلسلۂ سخن آخری عمر تک جاری رہا۔ وہ مظفر صدیقی صاحب کے یارِ غار تھے۔ ایسے وفادار اور مخلص دوست میری نظر سے بہت کم گزرے ہیں۔ مظفر صدیقی کا دمِ آخر درد ہوشیارپوری کے ہاتھوں میں ہوا۔ وہ کسی کام سے جے پور آئے ہوئے تھے۔ انتقال سے ایک روز قبل جے پور کے پرتاپ آڈیٹوریم میں ایک ادبی پروگرام میں میری دونوں بزرگوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ دوسرے دن درد صاحب کے مکان پر ہی مظفر صاحب کی طبیعت بگڑی اور وہ بات کرتے کرتے دنیا سے کوچ کر گئے۔ درد صاحب کو اپنے یارِ غار کی دائمی جدائی کا بہت صدمہ تھا۔ درد صاحب کے انتقال سے تقریباً ایک سال قبل میں اور نذیر فتح پوری (مدیر: اسباق، پونہ) ان سے ملنے گئے تھے۔ اس وقت انھوں نے اپنا تازہ کلام سنایا۔ کچھ اشعار مظفر صاحب کے اظہارِ غم میں بھی کہے تھے۔ مظفر صدیقی کے بعد درد صاحب واقعی اپنے آپ کو اس بھری دنیا میں اکیلا محسوس کرنے لگے تھے... بالآخر کچھ عرصہ بعد ہم مارچ ۲۰۱۲ کو وہ خود بھی ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔

٭٭٭

بقیہ: درد ہوشیارپوری

صفحہ ۸ سے آگے

میرے ظرف کا مقدر ہی مستقل فریبی
ہے یہی تو منزل ہے یہی نشانِ جادہ

لکھ لکھ کے جس نے چاہا مٹاتا رہا ہمیں
ہم عمر بھر اک حرفِ مکرر بنے رہے

جڑی ہیں جا بجا سرخ کرنیں بے کفن لاشیں
کفن کے جسم سے چادر اتار دے کوئی

وقت اس ناپاک سازش کو نہ بخشے گا کبھی
آج ہر چہرے پہ جو نفرت کا غازہ مل گئی

محروم گل ہیں آج وہی فصلِ گل میں درد
مدام جو رہے ہیں سدا باغبان کے

انسانیت کی لاش ہے کب سے ٹنگی ہوئی
آ کر اسے کوئی تو اتارے صلیب سے

یاد رفتگاں

درد ہوشیارپوری: شخص اور شاعر

ڈاکٹر محمد شاہد پٹھان (مہاتما گاندھی ہندی یونیورسٹی، وردھا، مہاراشٹر)

پریم سوشیل درد ہوشیارپوری کا شمار راجستھان کے ان غیر مسلم شعرائے کرام میں ہوتا ہے جنھیں اردو کے ساتھ ساتھ فارسی سے بھی کسی قدر آگہی حاصل تھی۔ بسمل بھرت پوری، آتش تاراپن فارغ، واقف، بوش سرحدی اور شاکر نظام وغیرہ اسی زمرے میں شامل ہیں۔

پریم سوشیل ابرول درد ہوشیارپوری ۲ مئی ۱۹۳۷ء کو بہ مقام ہوشیار پور (پنجاب) پیدا ہوئے۔ راجستھان سے انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کی اور یہیں محکمۂ آبپاشی میں ملازم ہوئے۔ ۱۹۹۵ء میں ڈونگرپور راجستھان کے محکمۂ آبپاشی سے بطور اسسٹنٹ انجینئر سبکدوش ہوکر بیپور میں سکونت پذیر ہوئے۔ درد ہوشیارپوری کی شعرگوئی کا سلسلہ چالیس برسوں پر محیط ہے۔ انھوں نے یوں تو دوسری اصناف سخن مثلاً نظم، قطعہ، ماہیے، ثلاثی وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے تاہم وہ بنیادی طور پر غزل ہی کے شاعر ہیں۔ رسائل وجرائد میں ان کا کلام کم شائع ہوا ہے۔ اپنے شعری سفر کے متعلق درد لکھتے ہیں:

"ملازمت کے سلسلے میں راجستھان کے مختلف اضلاع میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ چتوڑ گڑھ میں بزرگ استاد شاعر جناب ساغر اجمیری سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا جو ان دنوں چتوڑگڑھ کے قصبہ نمبیہڑہ میں سکونت پذیر تھے۔ موصوف گرامی کی صحبت انتہائی مفید ثابت ہوئی اور شعروادب میں واقعی دل چسپی کا آغاز ہوا، بعد ازاں بانسواڑہ پہنچا، قسمت نے میرا ساتھ یہاں بھی دیا اور اپنے ذوق کی تسکین کے اسباب فراہم کیے، یعنی اردو کے کہنہ مشق اور زود گو شعرا جناب مظفر صدیقی اور جناب بسمل نقشبندی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان حضرات کی قربت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور میرا شعور بیدار ہوا"۔

(اپنی بات، مبہم، ص ۱۰، مطبوعہ ۱۹۹۷ء)

درد ہوشیارپوری نے ساغر اجمیری سے کس قدر اثر قبول کیا اس کا اندازہ مشکل ہے، مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ بانسواڑہ میں اپنے قیام (تیرہ برس) کے دوران درد نے بسمل نقشبندی اور مظفر صدیقی سے یقیناً اثرات قبول کیے ہیں۔ بسمل نقشبندی کلاسیک پسند شاعر تھے، تصوف کے اثرات بھی ان کے یہاں نمایاں ہیں کہ وہ اس راہ کے سالک تھے جب کہ مظفر صدیقی (متوفی ۱۶ر جنوری ۲۰۰۹ء) بنیادی طور پر ایک ترقی پسند شاعر تھے۔ درد ہوشیارپوری تادم آخر ان کے یار غار رہے ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ درد صاحب مظفر صدیقی کے ترقی پسندانہ تصورات سے ضرور متاثر ہوئے ہیں۔

درد ہوشیارپوری کے اب تک دو شعری مجموعے 'مبہم' (۱۹۹۷ء) اور 'سفالہ' (۲۰۰۳ء) شائع ہو چکے ہیں۔ دونوں مجموعوں میں یوں تو نظمیں، قطعات، گیت، دوہے بھی شامل ہیں مگر بیشتر کلام غزلیہ شاعری پر مشتمل ہے۔ 'مبہم' میں ۹۲ اور 'سفالہ' میں ۷۵ غزلیں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کچھ غزلیات ہیں۔ انتقال سے قبل میری درخواست پر درد صاحب نے اپنی غیر مطبوعہ تخلیقات مجھے ارسال کی تھیں، ان میں غزلوں کے علاوہ چند قطعات بھی شامل ہیں۔ درد ہوشیارپوری نے اپنے تصور شعر کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ادب برائے زندگی کے نظریے کو میں نے ہمیشہ حق بجانب قرار دیا ہے۔ شعر میں مضمون کی ساخت کو عروض کی پابندیوں پر ترجیح دیتا ہوں لیکن ہمیشہ محترم سہل ممتنع سے آراستہ صاف بحور میں طبع آزمائی کی ہے۔ پُرکار مگر سادہ الفاظ کے ذریعے اپنے تجربات واحساسات کو اپنی نگارشات میں ضم کرنے کی کوشش کی ہے۔ صنائع بدائع کی اہمیت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے رعایت لفظی کے استعمال کی بھی حتی الامکان کوشش کی ہے"۔

(مبہم، ص ۱۲)

درد ہوشیارپوری کے نزدیک 'شاعری' فی نفسہ تخلیق کار کے ذاتی، داخلی اظہار سے کہیں زیادہ خارجی و اجتماعی جذبات و احساسات اور مسائل حیات کی مظہر ہے۔ یہی سبب ہے کہ درد ہوشیارپوری نے اپنی شاعری میں شعوری طور پر سماجی احوال وحقائق اور اجتماعی معاملات کو خاص اہمیت دی ہے۔ انھوں نے اپنے متعدد غزلیہ اشعار میں بھی اپنے تصور شعری کی صراحت کی ہے، مثلاً

اگر زمیں سے شاعر کا رابطہ ٹوٹے
تو پھر ردیف کو جوڑو تو قافیہ ٹوٹے

ازل سے شاعری پابند حق تو ہوئی ہے
وہ دن آئے جب ان کا معاہدہ ٹوٹے

کتاب ادب وطن کے لیے وقف کر دیا
میرا قلم سوال کرے گا ادیب سے

قبول کیوں نہ کروں درد غم زمانے کے
ازل سے جب کہ ملا دل ہی غمگسار مجھے

میری تلاش میں ہیں مضامین تو یہ تو
الفاظ میں جان کا مسیحا رہا ہوں میں

جناب درد ہیں درد آشنا کچھ اس قدر یارو
کبھی ان سے کسی کی بے بسی دیکھی نہیں جاتی

دنیا کی دنیا کے طلب گار رہتے ہیں
جب سہل تی ہے تو نئے شمس و قمر دے

زمانہ لاکھ میرے درد سے رہا غافل
مگر میں حال زمانہ سے بے خبر نہ رہا

لازم ہے میرے شعر کہنے کے لیے درد
ہر موسم تازہ کے اشارات بھی

پیش کردہ اشعار سے درد ہوشیارپوری کے شعری جہات، فکری زاویوں اور اسلوب کی تازگی کی کسی قدر نشان دہی ہو جاتی ہے۔ درد ہوشیارپوری نے اپنے احساسات و افکار کے اظہار کے لیے کلاسیکی ڈکشن کے ساتھ ساتھ جدید لفظیات اور استعارات کا بھی خاطر خواہ استعمال کیا ہے۔ علاوہ ازیں اپنے ترقی پسندانہ تصورات اور سماجی سروکاروں کے اظہار کے دوران انھوں نے ترقی پسند ڈکشن سے بھی بحسن و خوبی صرف لیا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا درد ہوشیارپوری شاعری میں اپنی ذات سے زیادہ سماج و معاشرے کو اہمیت تفویض کرتے ہیں چنانچہ ان کے یہاں اپنے ملک کے عوامی و اجتماعی مسائل و مظاہر کا بیان خصوصیت کے ساتھ ہوا ہے۔ درد کو اس حقیقت کا احساس ہے کہ آزادی کے چینسٹھ (65) سال گزر جانے کے باوجود آج بھی کروڑوں افراد ملک 'جمہوریت' کے ثمرات، فیضان و برکات سے محروم ہیں نیز استحصالی اور جابر قوتیں آج بھی ہمارے سماج میں موجود و متحرک ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک صحت مند سماج کے فروغ میں مذکورہ مذموم منفیات کی کوئی جگہ نہیں، ان کا ابطال و انسداد لازمی ہے۔ چنانچہ ہر فن کار کو اپنے ذہن رسا اور قلم کی قوت کا تخلیقی مظاہرہ کرنا چاہیے۔ درد کے حسب ذیل اشعار سے ان کے طریق فکر کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے:

ہر شخص کو ہوس ہے میسر آئیں نعمتیں
بڑھتا ہی رہا درد بیکار تیرے گھر میں

آجاتے ہیں ستم وقت نے مجبور سے درد
کہنے کو تو خوں ریزی چنگیزی بہت ہے

گرائے حادثات وقت نے جب تم خوابوں کے
تو ہر دیوار کے اندر مری خشت مکاں نکلی

سوچوں تو درد بحر مسلسل ہے زندگی
دیکھوں تو ایک سراب کے اندر سراب ہے

کسے الزام دیں تقدیر کو یا تیز دھاروں کو
لگایا پار طوفاں نے کنارے ہم کو لے ڈوبے

شکست گل تو سنگ کہیں پہ ہے بلبل
یقیناً دید کے قابل نہیں حالت گلستاں کی

نئے موسم نئے شکھ نے ظلم و ستم دیکھے
نو فصل گل ہی کو بدحواسی نظر میں نے

(بقیہ صفحہ ۲ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں   مطبوعہ: ثمر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی- ۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ) دو روپے، سالانہ ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکی ڈالر)
Phones: 23237212, 23237214
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org